© rasailojaraid.com

"To Have OR To Be?" ''نیا انسان نیا سماج''

Erich Fromm (مصنف)، امجد علی بھٹی (مترجم)، بک ہوم (پبلشرز)، ۱۷۶ اصفحات (ضخامت)، ۲۰۰۷ء (اشاعت)، ۱۸۰ روپے (قیمت)۔

ڈاکٹر حافظ محمد عبدالقیوم *

سلطنت روم کے زوال کے بعد یورپ میں جو نظام قائم ہوا وہ جاگیردارانہ تھا۔ یورپی جاگیردارانہ معاشرہ میں حرص و ہوس اور حسد کو مذہبی مقبولیت اور جواز کبھی فراہم نہیں کیا گیا تھا اور معاشرتی اقدار پر ہمیشہ مذہبی رنگ غالب رہا۔ اُخروی کامیابی کو دنیاوی ترقی کے مقابلہ میں ہمیشہ فوقیت حاصل رہی۔ مگر پندرہویں صدی کے بعد سے کلون ازم "Colonism" اور پروٹسٹنٹ تحریک نے سرمایہ داری اور دنیا پرستی کو مذہبی جواز فراہم کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر صنعتی انقلاب کے بعد سرمایہ دارانہ نظام نے یورپ کے پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس طرح وہاں حرص اور حسد نے غالب معاشرتی قدر کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس طرح یورپ میں جو معاشرہ سرمایہ داری کے تحت پروان چڑھا، وہ بنیادی انسانی اخلاقیات ہی سے عاری ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ اب حق و باطل، خیر و شر، غلط و صحیح کا پیمانہ سرمایہ ٹھہر گیا تھا۔

اس سماجی تبدیلی کے بارے میں جو ردِ عمل سامنے آئے ان میں سے ایک کارل مارکس کی آواز تھی۔ ۱۹۳۰ء کارل مارکس ہی کے افکار و نظریات کی بنیاد پر جرمنی میں فرنکفرٹ مکتب فکر وجود میں آیا جس کا پورا نام "Institute for Social Research" یعنی "Institue fur sozialforschung" تھا۔ اس ادارے نے آگے چل کر ہیگل، مارکس، نٹشے اور فرائیڈ کے افکار و نظریات کی روشنی میں تنقیدی نظریہ "criticial theory" کو پروان چڑھایا۔

ایرک فرام (۱۹۰۰ء-۱۹۸۰ء) اسی مکتب فکر سے وابستہ رہا ہے۔ وہ بنیادی طور پر سگمنڈ فرائیڈ سے متاثر ماہر نفسیات تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ فرام ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے نفسیاتی تجزیہ "Psycho analysis" کا اطلاق معاشرہ اور معاشرتی نظریہ پر کیا۔

ایرک فرام کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ مذہباً یہودی تھا اور وہ یہودیت کے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ کیونکہ اس کے والد، دادا اور پردادا یہودیوں کے مذہبی عالم ربی تھے۔ اس طرح ایرک فرام نے نہ صرف یہودیوں کی مذہبی

* لیکچرار- شیخ زاید اسلامک سینٹر، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتب کا مطالعہ کیا تھا بلکہ وہ اکثر اوقات ''تالمود'' پڑھتا رہتا تھا۔مگر ۱۹۲۰ء کے بعد اس نے ''تالمود'' کی سیکولر تعبیر کرنا شروع کردی تھی۔ اس طرح ایرک فرام میں تین چیزیں جمع تھیں اور انہی تینوں چیزوں کا عکس اس کی تحریروں میں نمایاں ہے۔

۱۔ یہودیت اور اس کی اخلاقی تعلیمات

۲۔فرائیڈ کے مکتبۂ فکر سے منسلک (اگر چہ وہ فرائیڈ سے اختلاف بھی رکھتا تھا)

۳۔ مارکسزم (اسی مارکسزم کے تحت وہ ''انسانیت پسند اشتراکیت'' Socialist Humanism کے بانیوں میں سے ہے)

ایرک فرام کی کتاب "To Have OR To Be?" کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ مصنف کا کہنا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے درمیان دو قسم کے طرزِ زندگی پائے جاتے ہیں، یا ان کا پایا جانا ممکن ہے۔ ایک "To have" یا "Having Mode" دوسرا "To Be" یا "Being Mode" ہے۔ مصنف نے دونوں قسم کے طرز زندگی کو OR کے ساتھ منضبط کیا ہے اور آخر میں سوالیہ نشان لگایا ہے۔ گویا کہ مصنف علم الاضداد کی رو سے یا ھیگل اور مارکس کے Dialectical Process کے تحت دونوں طرزِ زندگی کا موازنہ اور پھر ایک کی دوسرے پر فوقیت اور برتری ثابت کرنا چاہتا ہے۔

"Having Mode" سے مراد صارفیت پسندی "Consumerism" ہے جس کا تعلق سرمایہ داری سے ہے یعنی ایسی طرزِ زندگی جس میں انسان اخلاقِ رذیلہ اور اپنی خواہشات کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور اس میں انسانیت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ جبکہ "Being Mode" کا تعلق بنی نوع انسان "Human Being" سے ہے۔ یعنی ایسا طرزِ زندگی جس میں دوسرے انسانوں کا احساس رکھتے ہوئے اخوت ومحبت، ایثار وقربانی، ہمدردی وغمگساری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ "Being" کا تعلق ذاتِ مطلق "Absolute Reality" کے ساتھ بھی ہے۔ کیونکہ یونانی اور جدید مغربی فلسفہ میں "Being" ذات مطلق اور مابعد الطبعیات کا تصور بھی رکھتا ہے۔ جیسا کہ ہائیڈیگر Heidegger نے کہا ہے کہ مغرب نے Being کے تصور کو بھلا دیا ہے۔

اس طرح انسان، خدا اور انسان کا باقی انسانوں کے ساتھ اخلاق ورویہ کی تثلیث سامنے آتی ہے، جس کو مصنف اپنی کتاب میں واضح کرنا چاہتا ہے۔ مصنف نے کتاب کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ حصہ اول اور حصہ دوم میں مصنف نے سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح سرمایہ داری نے انسان کی پوری زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے اور پوری زندگی "Having Mode" بن کر رہ گئی ہے۔ جس میں انسان سب کچھ اپنی ملکیت میں لینا چاہتا ہے۔ اسی صفتِ ملکیت کا دوسرا نام حرص وہوس اور لالچ وطمع ہے۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ معاشی نظریہ اس مفروضہ پر قائم ہے کہ ہر شخص فطرتاً خود غرض ہے اور زیادہ سے زیادہ حصول لذت اس کی فطرت کا تقاضا ہے لہٰذا انسان نہ صرف خود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غرض اور لذت پرست ہے بلکہ اس کو ایسا ہی ہونا چاہیے (ص،۲۰،۱۴،۱۳) اسی وجہ سے صنعتی انقلاب کے بعد جدید انسان نے جس تیزی کے ساتھ طاقت حاصل کی ہے اسی تیزی کے ساتھ اس میں غیر انسانی رویہ بھی پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح انسان نے جتنی طاقت حاصل کی اس میں اتنی ہی انسانیت مرتی چلی گئی۔ (ص:۱۳)

مصنف کہتا ہے کہ انسانی جبلتوں میں سے اہم جبلت اس کی بقا ہے مگر جس صنعتی ترقی نے اسلحہ اور ایٹمی ہتھیاروں کی صورت میں جو انسان اور اس دنیا کی تباہی کا سامان فراہم کیا ہے اس سے بچنے کے لیے کوئی موثر اقدامات نہیں کیے جا رہے۔ نہ ختم ہونے والی کانفرنسیں اور قرار دادیں اور ہتھیاروں کو ختم کرنے کی بات چیت کر کے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ حکومت کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہے اور وہ بہتری کے لیے کوشاں ہیں مگر عملی طور پر کچھ نہیں ہوتا (ص:۲۰)

سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات زندگی کے کسی ایک پہلو میں نمایاں نہیں بلکہ اس کے اثرات روز مرہ کی گفتگو، انسانی محاورے، علم کے حصول، پڑھائی، عقیدہ، ایمان حتیٰ کہ محبت اور اس کے اظہار میں بھی نمایاں ہیں۔

"Having Mode" طرزِ زندگی نے روزمرہ زندگی میں جو محاوراتی تبدیلی کی ہے اس کی مثال کچھ اس طرح ہے کہ کوئی فرد اب ڈاکٹر سے کہتا ہے کہ ڈاکٹر مجھے مسئلہ ہے "I have a problem" بجائے اس کے کہ وہ کہے کہ میں مشکل میں ہوں "I am in Problem"۔ (ص:۲۷) اسی طرح محبتِ ذات کی تجدید اور ذات کی نشوونما کرتی ہے۔ مگر "Having Mode" کیفیت میں کی جانے والی محبت میں قید اور گھٹن محسوس ہوتی ہے اور یہ کیفیت محبت کا گلہ دبا کر مارنا چاہتی ہے کیونکہ ایسا شخص محبت کو اپنے کنٹرول میں کرنا چاہتا ہے۔ (ص:۴۸)

کتاب کا آخری یعنی تیسرے حصہ کا عنوان ''نیا انسان اور نیا سماج'' ہے۔ مترجم کتاب نے اسی تیسرے حصہ کے عنوان کو اپنی کتاب کا نام دیا ہے۔ تیسرے حصے میں مصنف نے موجودہ معاشرے کو سرمایہ داری کی طرف سے درپیش مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے اس حصے کو اگر حصہ اول کے تیسرے باب کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو مصنف کی یہ بات سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی کہ مستقبل کا انسان "Having Mode" طرز زندگی سے کس طرح چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے؟ چنانچہ مصنف کے نزدیک تمام مذاہب بالخصوص یہودیت، عیسائیت اور بدھ مت کی تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ زندگی میں "Being Mode" تصور کو اپنایا جائے۔ اسی میں انسان کی نجات ہے اور آخرت میں جنت کا مستحق قرار پائے گا۔ جبکہ "Having Mode" طرزِ زندگی شیطان کی پیروی کا نام ہے۔ (ص:۵۷۔۵۶)

اگر جدید انسان مستقبل میں نیا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے جو "Being Mode" تصور پر مبنی ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس میں مذہب کو بنیادی اور مرکزی حیثیت دی جائے کیونکہ مذہب "Being Mode" کو فروغ دیتا ہے۔ پھر مذہب نسل انسانی کی تخلیقی جبلت کا حصہ ہے (ص:۱۱۷۔۱۱۹) اور مصنف کے بقول کارل مارکس کی تعلیم بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی ہے (ص:۱۴۱،۵۲) مگر یہ بات پیش نظر رہے کہ مصنف جس مذہب کو معاشرے کے لیے ضروری قرار دے رہا ہے، وہ عیسائیت یا یہودیت نہیں بلکہ انسانیت پسند مذہب ہے (ص:۱۷۶)۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ مذہب خواہ کوئی بھی ہو مگر وہ لوگوں کے درمیان معاشرتی استحکام، اخوت ومحبت، ایثار وقربانی کے فروغ کے ساتھ ساتھ مارکسزم اور سیکولرزم کو مذہبی وعقلی جواز فراہم کررہا ہو۔ اور "Having Mode" کی بجائے "Being Mode" کو معاشرہ میں رواج دے رہا ہو۔ اس انسانیت پسند مذہب کے ساتھ ساتھ مصنف یہ بھی کہتا ہے کہ مستقبل کے نئے معاشرے کو ایٹمی ہتھیاروں سے باز رکھا جائے۔

اس طرح نئے معاشرہ میں روحانی عناصر اور عقلی سائنسی خیالات کی مدد سے ایک حیاتِ نو قائم ہوگی اور یہ ترکیب "City of Being" کہلائے گی۔ (ص:۱۷۶)

مصنف ایرک فرام مارکسزم اور سوویت یونین میں قائم سوشل ازم میں فرق کرتا ہے۔ اس طرح مصنف سوشل ازم کا جو سوویت یونین میں رائج نظام، اندھا حامی نہیں ہے، بلکہ اس امر پر واشگاف الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مغربی سماجی جمہوریت پسند اور ان کے زبردست دشمن کمیونسٹ، سوویت یونین نے سوشل ازم کو خالصتاً معاشی نظریہ بنا دیا ہے جس کی منزل حد درجہ کا خرچہ اور حد درجہ کا مشینی استعمال بن گیا اور سوشل ازم اور کمیونزم نے متوسط طبقہ کو مادہ پرست بنا دیا ہے۔ (ص:۱۳۷)

مصنف کی یہ کتاب اس کی دوسری کتاب ''صحت مند معاشرہ'' "Sane Society" کا تتمہ یا خلاصہ دکھائی دیتی ہے۔ مصنف نے جن مباحث کو ''صحت مند معاشرہ'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں ان پر اشارۃً بات کی ہے۔ اسی طرح مصنف نے ''صحت مند معاشرہ'' میں اپنے مجوزہ نظام "Communitarian Socialism" یا "Human Socialism" کی خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ (اس کتاب "Sane Society" کا اردو ترجمہ بھی قاضی جاوید صاحب کے قلم سے آج سے کم وبیش دس سال قبل ہو چکا ہے۔ اب یہ کتاب دوبارہ پرنٹ ہوکر فکشن ہاؤس لاہور کی طرف سے مارکیٹ میں موجود ہے۔)

یہ کتاب "To Have or To Be?"، کم وبیش تیس سال پرانی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کتاب کے مندرجات اور مضامین کیا اب بھی تروتازہ ہیں؟ اس بارے میں میرا جواب اثبات میں ہوگا، جس کی تین وجوہات ہیں۔

۱۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد سوشل ازم کے حامیوں اور فلاسفہ کے درمیان یہ بحث عمومیت اختیار کرگئی ہے کیا زوال کی دیگر وجوہات میں سے ایک اہم وجہ زندگی کے معاشی، سیاسی اور سماجی میدان سے مذہب کو بے دخل کرنا تھا؟ اس لحاظ سے اب سوشل ازم کے حامی اپنے فکری نظام میں مذہب کی سماجی وسیاسی اہمیت محسوس کررہے ہیں اور معاشرہ میں کارل مارکس اور دیگر سوشلسٹ زعماء کی تحریروں سے مذہب کا جواز فراہم کررہے ہیں۔ یہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کام ایرک فرام نے آج سے تیس سال قبل کیا تھا۔

۲۔ دو قطبی عالمی نظام میں "Bipolar World" سرمایہ داری نظام کا مکروہ چہرہ دنیا بالخصوص مسلم دنیا کے سامنے نہیں تھا۔ چنانچہ "Unipolar" نظام میں رہتے ہوئے سرمایہ داری کی عالمی استبدادیت اور جبریت کو آج کوئی دیکھنا چاہتا اور پڑھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ایرک فرام کی دونوں کتب کا مطالعہ ضروری ہے۔

۳۔ اور پھر اب دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے عالمی سطح پر متحرک ہونے سے جس کشمکش کا آغاز ہوا ہے اس کو بھی "To Have" اور "To Be" کے درمیان کشاکش قرار دیا جا رہا ہے۔

اس لحاظ سے اس کتاب کی مباحث تیس سال پرانی ہونے کے باوجود آج بھی نئی اور تروتازہ ہیں۔ ان مباحث کی آج سے تیس سال قبل شاید اتنی اہمیت محسوس نہ کی گئی ہو جتنی آج کی جا رہی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب "To Have or To Be" کا پہلا ایڈیشن انگریزی زبان میں امریکہ سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب اس وقت سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتب میں سے تھی۔ اب اس کتاب کا اردو ترجمہ کم و بیش تیس (۳۰) سال بعد کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے مترجم ایک منجھے ہوئے مترجم ہیں اور ترجمہ کے میدان میں بھی تجربہ رکھتے ہیں۔ اس سے قبل مترجم مغربی فلسفی روسو کی آپ بیتی کا بھی ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے مترجم کے ترجمہ میں سلاست اور روانی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مترجم نے کتاب کے مندرجات اور مضامین کو اپنے تہذیبی پس منظر میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور خواہ مخواہ لفظی ترجمہ میں نہیں الجھے ہیں، جس کے لیے مترجم مبارک باد کے مستحق ہیں۔

البتہ بعض مقامات پر مترجم نے قصداً و سہواً انگریزی عبارات کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔ جن میں سے ایک عبارت حسب ذیل ہے؛ اسی طرح مترجم کو بعض چیزوں کے سمجھنے میں شاید غلط فہمی ہوئی ہے مثلاً۔ وہ "Copula" کو کسی مغربی شخصیت کا نام سمجھ بیٹھے ہیں اس کے ساتھ ساتھ "Copula" کو "Capula" لکھا ہے۔ مثلاً مترجم ص: ۳۰ پر اس طرح ترجمہ کرتے ہیں'' کاپولا "Capula" فاعل کے بارے میں یہ اصطلاح بتاتے ہیں۔''

اگلے صفحہ ۳۱ پر پھر دوبارہ Copula کو capula لکھا ہے۔

"Benveniste's study throws new light on the meaning of "To Be" as a verb in its own right rather than as a copula. "to be" in Indo-European languages, is expressed by the root *es*, the meaning of which is "to have existence, to be found in reality." Existence and reality are defined as "that which is authentic,

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

consistent, true." (In Sanskrit, *Sant*, "existent," "actual good", "true"; superlative *Sattama*, "the best.")"Being" in its etymological root is thus more than a statement of identity between subject an attribute; it is more than a descriptive term for a phenomenon. It denotes the reality of existence of who or what *is*: it states his / her / its authenticity and truth. Stating that somebody or something *is* refers to the person's or the thing's essence, not to his/her/its appearance." (English p.20, Urdu Translation p.31)

درج بالا عبارت کے ترجمہ میں مترجم نے غلطی بھی کی ہے اور عبارت کا ترجمہ چھوڑ بھی دیا ہے۔

مترجم کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

بین ویست کا مطالعہ "To Be" کے معنوں پر روشنی ڈالتا ہے اور اسے فعل کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ "Capula" کے بجائے یورپ کی زبانوں میں "To Be" کا مطلب وجود رکھنا ہے۔ ایک حقیقت کے طور پر وجود اور حقیقت کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ جو اس کا اصل ماخذ ہے۔ اس مظہر کو بیان کرنے والی اصطلاح ہے۔ یہ حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ کون کیا ہے؟ اس سچائی کی تعریف کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ کس شخص یا کس چیز کی اصل کیا ہے۔ نہ کہ اس کی ظاہری حالت کو ظاہر کرتی ہے۔ (اردو ص:۳۱)

"Copula" کسی فرد کا نام نہیں بلکہ انگریزی گرامر میں "Copula" کا مطلب رابط کے ہیں یعنی لفظ یا جملے کا وہ حصہ خصوصاً فعل 'ہونا' کی کوئی شکل جو فاعل اور خبر کے درمیان تعلق ظاہر کرے، مثلاً "Zayed Became ill"، اس جملہ میں "became" انگریزی گرامر میں "copula" کہلاتا ہے جو "Zayed" اور "ill" کے درمیان رابط ہے۔

"Sociolinguistic" کا ترجمہ عمرانیات کر دیا گیا ہے۔ (ص:۳۰) اسی طرح "Premise" کا ترجمہ 'وعدہ' کیا گیا ہے (ص:۱۶)

مصنف ایرک فرام کہتا ہے کہ "being" کا متضاد "becoming" ہے (... and the opposite of becoming) مگر مترجم نے اس بحث کو چھوڑ دیا ہے۔ (اردو ص:۳۲، انگریزی، ص:۲۱)

صفحہ ۳۴ پر مترجم نے کچھ اس طرح ترجمہ کیا ہے:

''نئی سے نئی چیز جدید صارفین اپنے آپ کو اس فارمولے مساوات کی مدد سے پہچانتے ہیں۔''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درج بالا ترجمہ میں ''نئی سے نئی چیز'' کا تعلق نہ تو جملے سے ظاہر ہو رہا ہے اور نہ ہی مصنف نے ایسا کوئی لفظ لکھا ہے جس کا یہ ترجمہ ہو، اس لیے مترجم کی طرف سے یہ اضافہ ہے جس سے جملہ بے ربط ہو رہا ہے۔ اس کے فوراً بعد مترجم نے فارمولے کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا ہے؛

میں کیا کہوں = میرے پاس کیا ہے + میں کیا خرچ کرتا ہوں۔'' (ص:۳۴)

اب میں اس سارے کی انگریزی عبارت نقل کرتا ہوں تا کہ بات واضح ہو جائے۔

"Modern consumers may identify themselves by the formula:

I am = What I have and What I consume."

آخر پر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ فلسفیانہ مباحث کی حامل اس کتاب کے اردو ترجمے اور اشاعت پر مترجم اور کارپردازان ادارہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے قارئین اس کاوش کو پذیرائی بخشیں گے۔

© rasailojaraid.com